# حُسنِ انتقاد

تبصرہ کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

تبصرہ: حافظ صفوان محمد چوہان

● ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے اشارات ومباحث    مرتب: جاوید اختر بھٹی

اشاریہ سازی کے بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ اشاریہ سازی (Indexing) اور فہرست سازی (Cataloguing) طالب علموں کا کام ہے یا لائبریری کلرکوں کا؛ یہ تیسرے درجے کے محققوں کا کام بھی نہیں۔ دوسری طرف اشاریہ سازی ہی کو کارِ تحقیق سمجھ کر نہایت خشوع وخضوع سے اِس کام کو کیے چلے جانے والے اصحاب بھی موجود ہیں، جن کے نزدیک یہ بھی ایک باقاعدہ فن یا دبستان ہے۔ یہ دونوں رویے بہت متشددانہ ہیں۔ پہلے نظریے کے حاملین کی بات کو اگر مِن وعن تسلیم کرلیا اور اِس کے امتثال میں قدم اُٹھا لیا جائے تو ہماری جامعات میں کرایا گیا بہت سا تحقیقی کام نہ صرف کالعدم ہوجائے گا بلکہ تحصیلِ علم کی تکمیل پر جاری کی جانے والی اسناد میں سے ڈھیروں غیر موثر ہوجائیں گی۔ (یاد رہے کہ یہاں تحقیقی کام سے مراد صرف بے چاری اردو یا کسی حد تک تمام مشرقی زبانوں سے متعلق لکھے جانے مقالات ہیں۔) اشاریہ سازی کو اصل کارِ تحقیق سمجھ کر کام کرنے والوں کی رائے میں یہ ایک بنیادی نوعیت کا کام ہے جس کے ذریعے آیندہ تحقیق کرنے والوں کو بہت آسانی رہتی ہے اور اُنھیں بہت سا حوالہ جاتی مواد یک جا مل جاتا ہے، جو یقیناً ایک بڑا کارِ خیر ہے جس سے ادبی تحقیقی مقالے بہت زرخیز ہوسکیں گے۔

تفننِ طبع کے لیے عرض ہے کہ اگر ''اشارات'' پر مشتمل کتابوں کو ''ادبی کھاد'' سے تشبیہ دی جائے تو پاکستان میں مقتدرۂ قومی زبان کو بلاتردد ادبی کھاد سازی کا سب سے بڑا کارخانہ کہا جاسکتا ہے کیوں کہ انھوں نے اشاریہ/فہرست سازی پر بہت زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔ مزید عرض ہے کہ مقتدرہ والوں سے رابطہ کرکے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے اُن کی شائع کردہ اشاریہ/فہرست سازی کی کتب سے فائدہ اُٹھانے والوں کی شرح نیز اِن فائدہ اُٹھانے والوں کی غیر جانب دارانہ رائے اِن کتب کی بابت کیا ہے۔ یوں اشاریہ/فہرست سازی کے بارے میں مذکورۂ بالا بعد القطبین آرا کے حاملین باہم قریب ہوسکیں گے۔

اوّل الذکر رائے/نظریہ رکھنے والوں کا واویلا بے جا بھی نہیں ہے۔ آج بہت سے ادبی رسالے (ماہنامے/سہ ماہی وغیرہ) ایسے ہیں جو اپنے ہر سال کے آخری شمارے میں سالِ رواں میں شائع ہونے والے تمام مضامین کا تفصیلی موضوع وار اشاریہ پیش کردیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ابھی پچھلے دنوں راقم نے ایک اصلاحی رسالے میں یہ ترتیب دیکھی کہ وہ اپنے ہر شمارے کے اندر گزشتہ ماہ میں پورے پاکستان وہندوستان میں شائع ہونے والے اہم مضامین کی فہرست نیز انٹرنیٹ پر موجود کئی اہم مضامین کی ویب سائٹس کے پتے شائع کرتے ہیں۔ تو جب اشاریہ سازی محض ایک صحافتی درجے کا کام ہوا-- یا اگر مضامین کا

یہ اشاریہ کسی بہت پرانے مجلّے کے اندراجات کا ہے جو اَب صرف کسی لائبریری میں ہی موجود رہ گیا ہو تو یہ کام لامحالہ لائبریری کلرک کے کرنے کا ہوا؛ دریں صورت اِس کام کو تحقیقی مقالے کا عنوان بنا دینا جہاں اِس بات کا مظہر ہوا کہ جو طلبہ نقدِ وقت لے کر کسی استادِ ادب کے پاس آ ئے اور اُن کا وقت کم تر درجے کی مصروفیت میں استعمال کر کے اُن کا استحصال کیا گیا اور اُن کا تحقیقی مزاج ہی نہ بننے دیا گیا وہاں یہ حقیقت بھی آشکارا ہوئی کہ ہماری جامعات میں ادبی تحقیق کے عمومی معیار کی سطح کیا ہے اور موضوعاتِ تحقیق کا کس درجہ فقدان ہے۔ یا بقول ایک ستم ظریف کے، فقدان کی قلت پائی جاتی ہے۔

بہر حال۔ ہر کام کی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ غالب کو حالی جیسا نقاد اور بجنوری جیسا طرف دار ملا تب ہی بات بنی ورنہ کیا معلوم اُسے کتنے برس تک ''مغلوب'' رہنا پڑتا۔ چناں چہ اگر اشاریہ/فہرست سازی بھی، کسی مستقل ادبی اہمیت کی چیز کی ہو تو اِس کام کو بھی دوام اور قبولِ عام ملے گا ورنہ اگر یہ کسی مثلاً ابنِ انشا کی ''استادِ مرحوم'' کے خاکے میں ذکر کردہ ''ریواڑی گزٹ''، قبیل کے کسی ماہنامے کے مندرجات پر دادِ تحقیق ہو تو ایسی محنت کا نتیجہ معلوم!

اپنے نہایت محدود مطالعے کی روشنی میں اب تک اشاریہ/فہرست سازی کے سلسلے میں جو اہم کام میرے سامنے آیا ہے اور جو واقعی ''کام'' کہلائے جانے کا سزاوار بھی ہے، وہ عاصمہ اعجاز (اب عاصمہ وقار) کی مرتبہ ''غالب نامہ-- تجزیاتی مطالعہ'' ہے۔ یہ کتاب دراصل دہلی سے نکلنے والے ایک سہ ماہی (بعد ازاں شش ماہی) ادبی مجلّے ''غالب نامہ'' پر اُن کا ایم اے کا تحقیقی مقالہ تھا جسے ضروری اشاعتی ترامیم کے ساتھ شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور نے فروری ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔ یہ ''تجزیاتی مطالعہ'' صرف اشاریہ نہیں ہے بلکہ اِس کا ایک فی ذاتہٖ وجود (Independent standing) بھی ہے: اِس میں Indexing کے ساتھ ساتھ انتہائی محنت کر کے ہر ہر تحریر میں صاحبِ تحریر کا نقطۂ نظر بہت اختصار کے ساتھ (بیش تر اُن کے اپنے الفاظ میں) پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جسے تکنیکی زبان میں ''ہو بہو'' (Faithful) پیش کش کہا جانا چاہیے۔ عاصمہ کی یہ محنت اِس پائے کی ہے کہ اِسے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اور مرحوم مشفق خواجہ صاحب نے بھی بہت سراہا ہے۔ اِس ضمن میں دوسرا کام جو اِس کینڈے کا ہے کہ اُس نے فی الحقیقت حیرت زدہ کر دیا ہے-- وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے جاری کردہ اخبارات ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے اشارات و مباحث ہیں جنھیں جناب جاوید اختر بھٹی صاحب نے سالہا سال کی شبانہ روز سرگرمی و بے تابی سے مرتب کیا ہے۔

''الہلال'' اور ''البلاغ'' کا غلغلہ آج بھی ادبی، صحافتی، سیاسی اور دینی حلقوں میں پایا جاتا ہے گو کہ اِن کی تاریخ قریب قریب ایک صدی پرانی ہو چکی ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ اِس کے متعلقین اور قلمی تعاون کرنے والوں میں شبلی اور سید سلیمان ندوی جیسے عبقریوں کے ساتھ ساتھ مولانا عبدالسلام ندوی، عبدالماجد دریابادی اور عبدالرزاق ملیح آبادی جیسے بڑے لوگوں کے نام آتے ہیں جن کے اشہبِ جہندہ قلم کی سند مرورِ زمانہ نے یوں دے دی ہے کہ اِن کی تحریریں آج بھی زندہ ہیں اور بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

جناب جاوید اختر بھٹی ادب کے بڑے ٹھیّوں سے دور اور دبستانوں سے الگ، ایک دور دراز جگہ، ملتان، میں اپنی ادبی منڈلی سجائے ایک عرصے سے ادبی کالم اور افسانے لکھ رہے ہیں اور فلسفۂ مذاہب اور ہندی اردو تنازعات جیسے موضوعات پر کتابیں بھی لکھ چکے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ قبل چند مشاہیرِ ادب کے سوانحی خاکے بھی اُنھوں نے مرتب کیے؛ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں بہت سی ضخیم اور حوالہ جاتی کتب کا نچوڑ ہے اور ہر حوالے سے یہ کتاب اُن کی کتاب دوستی اور کتب بینی کے اعلیٰ اور وسیع ذوق پر دال ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد پر کام کر رہے ہیں۔ ''فیضانِ آزاد'' کے نام سے ایک کتاب سامنے آئی جس میں مولانا آزاد کی کتابوں سے اُن کی فکر کے آئینہ دار مضامین، اُن کے سدا بہار جملوں اور شاعری، اور اُن کے مقام سے آشنا لوگوں کی آراء کا انتخاب تھا۔ بھٹی صاحب کی ''الہلال'' اور ''البلاغ'' پر ''کوئی کام'' کرتے رہنے کی خبر ایک عرصے سے گرم تھی۔ سچی بات ہے کہ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک ایسا کام کر رہے ہیں جس سے استفادہ کر کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' پر کام کرنے والوں کو آیندہ کوئی ہفت خواں طے نہ کرنا ہوگا۔ وہ سر جھکا کر ایک ایسا کام کرتے چلے گئے جس کی وَقعت پر کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا۔ مولانا آزاد پر جب بھی کوئی توصیفی کام سامنے آتا ہے تو ذہن میں فوراً اکبر کا شعر آتا ہے:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں

یعنی یہ کون سودائی ہے جو اِس زمانے میں مولانا آزاد کا نام لے رہا ہے۔ آفریں بادِ بریں ہمتِ مردانہ تو (بلکہ جراتِ رندانہ تو) جنابِ جاوید اختر بھٹی!

..................

تقریباً نو سو صفحات پر پھیلا ہوا یہ کام ایک غیر معمولی شخص ہی کر سکتا تھا جس کا حضرتِ ممدوح سے تعلق بھی غیر معمولی نوعیت کا ہو۔ جاوید بھٹی صاحب کا تعلق مولانا آزاد سے بہت ہی غیر معمولی ہے جو کتاب پر اُن کے ''افتتاحیہ'' سے مترشح ہے۔ اُن کا مولانا آزاد سے تعلق ایک اور رنگ میں اُن کی ''فیضانِ آزاد'' سے سامنے آتا ہے جس کے دیباچے ''روشنی کا سفر'' میں وہ لکھتے ہیں:

''مجھے اِس بات پر فخر ہے کہ میں مولانا آزاد کے عہد میں پیدا ہوا۔ جب میں بیس دن کا تھا، اُنھوں نے اِس دنیا سے کوچ کیا۔ میرا گمان ہے کہ گھر میں کسی فرد نے ضرور کہا ہوگا کہ مولانا آزاد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور یہ آواز میری سماعت تک یقیناً آئی ہوگی......''

عقیدت واحترام کا یہ انداز میرے لیے بالکل نیا اور بہت حیران کن ہے۔

پاک و ہند میں مولانا کے چاہنے والے بہت ہیں، اور یہ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کا اُن سے تعلق اُن کے علم کے ظاہر کی وجہ سے ہے۔ مولانا کی تحریر و تقریر بہت ذہنوں کو آج بھی مسحور کیے ہوئے ہے۔ واقعی اردو زبان کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ، بقول ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا کی زبان سے بولی اور اُن کے قلم سے لکھی گئی۔ ایسے لوگ البتہ کم کم ہیں جو مولانا آزاد کی فکر، اُن کے دینی اور بعدازاں سیاسی کردار پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ اُن کی فکری اور سیاسی جدوجہد بڑے واضح، متعین اور قطعی انداز میں

تین الگ الگ ادوار پر مشتمل ہے: پہلا دور تعلیم اور ابتدائے صحافت سے ۱۹۲۰ء تک؛ دوسرا ۱۹۲۰ء سے تقسیمِ ہند تک اور تیسرا تقسیمِ ہند سے دمِ واپسیں تک۔ پہلے دور میں مولانا کی ادبی حیثیت مستحکم ہوچکی تھی جب کہ سیاسی زندگی کا آغاز تھا۔ دوسرا دور خلافتِ عثمانیہ سے اُن کے قریبی قلبی تعلق اور اِس تناظر میں اُن کی سیاسی حیثیت سے شروع ہوا اور وہ ہندوستانی قوم پرور نظریے کے سب سے بڑے پرچارک کی صورت میں اِس نظریے کے حاملین کے ہراول رہے۔ اُن کی سیاسی زندگی کا تیسرا دور وہاں سے شروع ہوتا ہے جب اُن کے سب سیاسی ساتھی بلاتفریقِ مذہب، اور ''ہندوستانی قومیت'' کا کارواں بھی -- اُن کا ساتھ چھوڑ گئے اور اُن کا نظریہ قوم کی ایک اکثریت نے، گو بہت زیادہ دیر کے لیے نہ سہی، مسترد کر دیا۔ اُن کا یہ آخری دور مسلمانانِ ہند کی تہذیبی ہستی کے بقا اور تعلیمی و ثقافتی شعائر کی حفاظت سے عبارت ہے۔ اردو زبان کے لیے اُن کی خدمات اِس دور کے ماتھے کا جھومر ہیں۔

اردو زبان کی ترویج و اشاعت مستقلاً مولانا آزاد کا مطمحِ نظر رہی۔ اردو زبان کا کوئی سنجیدہ طالبِ علم ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے اِس کردار سے پہلوتہی نہیں کرسکتا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے کے لیے ایک اعلان ۲۹/ جنوری ۱۹۱۳ء کے ''الہلال'' میں شائع کرایا جس میں اُن کا وہ جملہ ہے جو بعد میں بہت مشہور ہوا:

> ''......چوں کہ اردو زبان کا قائم کرنا اور ترقی دینا تمام اہلِ ملک کا فرض ہے لہٰذا مجھے قوی امید ہے کہ پبلک میری دست گیری کرے گی۔''

اِس کے علاوہ مسئلۂ وضعِ اصطلاحات پر بحث اور مغربی فلسفیانہ خیالات کو اردو میں لکھنے میں مدد دینے کے لیے فرہنگِ اصطلاحات کی باقاعدہ تجویز بھی سب سے پہلے ''الہلال'' ہی میں دی گئی۔ یہاں تک کہ ''الہلال'' کی آخری اشاعت میں بھی اردو طباعت کے لیے نستعلیق کی ترویج پر کرائی گئی ووٹنگ کے نتائج دیے ہوئے ہیں۔ میری رائے میں اردو کی اشاعت و ترویج اور رسم الخط کے حوالے سے ''الہلال'' کی خدمات ایک باقاعدہ موضوعِ تحقیق ہے جس پر گہرا کام کرایا جاسکتا ہے، اور جاوید اختر بھٹی صاحب کی یہ کاوش اِس سلسلے میں بہت مددگار ہوگی۔

نیاز فتح پوری نے ایک بار مولانا آزاد کو اپنے خط میں لکھا:

> ''آپ کی نیت میں خلوص ہے۔ اور وہ خلوص مبنی ہے ایک ایسی ذات کے کلامِ معجز نظام پر، جس کو کبھی، کسی زمانے میں، آن کے لیے بھی فنا نہیں ہونا ہے۔ اِس لیے میری رائے تو یہ ہے کہ بالکل بے خوف ہوجائیے۔ بلکہ ذرا اور بے دردی سے کام لے کر دلوں کو توڑیے کہ یہاں جڑنے سے پہلے ٹوٹنے کی ضرورت ہے۔''

حادثۂ کانپور کے بارے میں بہت لکھا اور کہا گیا۔ بڑی کتب بھی اِس موضوع پر ملتی ہیں۔ لیکن جیسا واضح اور مدلل، مبنی بر حقائق رپورتاژ ایک خط کی شکل میں جناب محمود احمد عباسی صاحب نے لکھا ہے، وہ بڑے کمال کی چیز ہے۔

(''الہلال''؛ ۲۳/ جولائی ۱۹۱۳ء)

مولانا آزاد مسلمانانِ ہند کا ملی و قومی ورثہ تھے۔ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کا زمانہ اُن کا وہ سیاسی دور تھا جس وہ اِس سیاسی نظریہ سازی میں مصروف رہے کہ ہندی مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی فریضہ یہ ہے کہ وہ مذہب کی بنیاد پر ایک قوم بن

جائیں۔ وہ بڑے دوٹوک انداز میں اسلام کے دینِ خالص ہونے اور اِسے ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک رکھنے اور شعائرِ اسلام کی حفاظت کا عزم کرتے ہیں۔ مثلاً ''حقیقتِ اسلام'' میں فرماتے ہیں:

''یہی وہ اسلام ہے جسے اسلام جہاد فی سبیل اللہ سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی اسلام کی جگہ جہاد اور کبھی جہاد کی جگہ اسلام، کبھی مسلم کی جگہ مجاہد اور کبھی مجاہد کی جگہ مسلم بولتا ہے۔ اِس لیے کہ حقیقتِ جہاد، اپنا سب کچھ اُس کے لیے قربان کر دینا ہے۔ ہر وہ کوشش و سعی جو اِس کی خاطر ہو، وہ جہاد ہے۔...... تاہم آج کل کے ملحد مسلمین اور مفسدین کا ایک حزب الشیطان بے چین ہے کہ بس چلے تو یورپ سے درجۂ تقرب وعبودیت حاصل کرنے کے لیے تحریف الکلم عن مواضعہٖ کے بعد سرے سے اِس لفظ [جہاد] کو قرآن سے نکال دے...... میں صاف کہتا ہوں کہ اسلام کی حقیقت ہی جہاد ہے، دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اسلام سے اگر جہاد کو الگ کرلیا جائے تو وہ ایک ایسا لفظ ہوگا جس کے معنی نہ ہوں۔ ایک اسم ہوگا جس کا مسمّی نہ ہو۔''

مسلمانوں کی مسلمانیت کو اجاگر کرنے اور اُنھیں دوسروں کا دستِ نگر بن کر رہنے کے بجائے اللہ والے یقین واعتماد کے ساتھ عمل پر ڈالنے کے ذیل میں مولانا کے الفاظ بڑے عہد آفریں ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے: ''مسلمانوں کے دل اگر مر نہیں گئے تو اب تو ہوش میں آجائیں...... اپنے لیڈروں پر بہت بھروسہ کر چکے، اب کچھ دنوں کے لیے اپنے خدا پر بھی اعتماد کر کے آزمالیں۔

مسلمانوں کو اندرونی وبیرونی خطرات سے آگاہ کیے رکھنے میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کا کردار نہایت روشن رہا ہے۔ ایک اداریے میں مولانا نے لکھا:

''افسوس کہ ہماری اصلی بدبختی یہ نہیں ہے کہ ہمارے اوپر کون ہے۔ بلکہ بدبختی یہ ہے کہ ہمارے اندر کون ہے؟ ہماری بدقسمتیوں میں ہمیشہ غیروں سے زیادہ خود اپنوں کا دستِ کفر ونفاق مخفی ہوتا ہے۔''

''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی پالیسی بیان کرتے ہوئے ایک بار لکھا:

''پس ہماری تعلیم وہی ہے جو اسلام کی ہے۔ اسلام سے بڑھ کر دنیا میں کوئی تعلیم بغاوت وفساد کی دشمن نہیں۔ ایک شخص اگر مسلمان ہے تو وہ کبھی فتنہ وفساد اور بغاوت کا مجرم نہیں ہوسکتا۔ اگر ہندو ایکسٹریمسٹ ایسا کرتے ہیں تو مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیے کہ گورنمنٹ کے نہیں بلکہ خدا کی زمین پر امن قائم کرنے کے لیے اِس کو دور کرنے کی سعی کریں۔''

مولانا ابوالکلام آزاد کے جملے کل بھی باوقار، شان دار اور جان دار تھے اور آج بھی ہیں۔ آج بھی کہیں کوئی اُن کا سا مرصع جملہ یا عربیت وفارسیت سے توام بھاری بھرکم ترکیب استعمال کرے تو اِسے اِدعائے علم (Pedantry) تو کہا جاسکتا ہے، کلیشے پرستی کی پھبتی بہرحال نہیں کسی جاسکتی۔

مجموعی حیثیت میں کتاب بہت جاذبِ نظر ہے۔ سرورق پر دی گئی تصویر بہت خوب صورت ہے۔ بہتر ہوتا کہ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' سے چند تصاویر بھی منتخب کر کے ساتھ شائع کی جاتیں اور مولانا آزاد کی چیدہ چیدہ تصاویر کا ایک انتخاب بھی ساتھ ہوتا۔ پروف کی اغلاط بھی کوشش کر کے کم کی جاسکتی تھیں۔ املا میں یکسانی نہیں ہے۔ بہ ہرحال، جس چیز پر سب سے

زیادہ توجہ دی جانی چاہیے تھی وہ کتاب کی عمومی پیش کش (presentation) ہے: بہت مناسب ہوتا کہ اگر الہلال/البلاغ کا ہر شمارہ نئے صفحے سے شروع کیا جاتا، تاکہ مطالعے اور مواد کی تلاش میں آسانی پیدا ہو جاتی۔

اِس کتاب کو بیکن بکس ملتان نے بہت اہتمام سے شائع کیا ہے جس پر وہ بہت مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ضخامت ۸۹۶ صفحات، قیمت ۶۰۰ روپے۔ (۱۴/اگست ۲۰۰۵ء)

﴿تبصرہ: سید یونس الحسنی﴾

● کتاب: فتنۂ انکارِ حدیث اور پرویز کا اسلام — مصنفین: مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ، منشی عبدالرحمٰن خانؒ

ناشر: المیزان ناشران وتاجران کتب اردو بازار لاہور

یوں تو یہ دورِ فتن ہے۔ دین اسلام کے خلاف کئی ایک الحادی تحریکات بظاہر اور بباطن چل رہی ہیں مگر یہ الحاد وزندقہ کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ ازمنہ گزشتہ میں بھی حقانیت اسلام ہمیشہ اغیار کا ہدفِ اوّل رہی ہے۔ ہمارے دور میں جو شخص اس گروہِ نامراداں کے سرخیل کے طور پر سامنے آیا وہ ایک گھساپٹا بیوروکریٹ مسٹر پرویز تھا۔ اس نے طلوع اسلام کے نام سے تجدید کی جس تحریک کی نیو اٹھائی اس کی بنیادی ستون بالکل وہی تھے جو اس کے روحانی واصطلاحی بڑوں نے تعمیر کیے تھے یعنی:

(۱) قرآن پاک کی معنوی تحریف

(۲) اطاعتِ رسول سے بہ لطائف الحیل انحراف

(۳) احادیث نبوی کی حجیت سے انکار

(۴) تقلید اسلاف سے بغاوت

اپنے بڑوں کی نسبت پرویز بہت شاطر نکلا۔ اس نے خصوصاً جدید تعلیم کے رسیاؤں کو مرکز نگاہ بنا کر کام آغاز کیا۔ کچھ باتیں دوٹوک انداز میں کرتا اور زیادہ تر ادب وانشاء پردازی کے جمالِ جہاں تاب کا سہارا لیتا۔ اُس کا وار کارگر ہوا اور بہت سے مغربیت پسند یا جدت پرست طبقات اس کے ہم نوا بن گئے۔ وہ حسب ضرورت عشق اقبالؒ کا مدعی بن کر لوگوں کو بیوقوف بنانے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ قرآن حکیم کی موجودگی میں ہمیں احادیث کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ اطاعتِ رسول ﷺ کی (نعوذ باللہ) کوئی حقیقت نہیں۔ کبھی وہ تلاوت قرآن پر معترض ہوتا ہے تو کبھی اللہ اور رسول کی ذات سے انکاری نظر آتا ہے۔ مثلاً وہ اپنی کتاب ''قرآنی فیصلے'' ص ۱۰۴ پر لکھتا ہے کہ:

(۱) ''یہ عقیدہ کہ بلا سوچے قرآن کے الفاظ دہرائے سے ''ثواب'' ہوتا ہے یکسر غیر قرآنی عقیدہ ہے۔''

(۲) ''خود رسول (ﷺ) کو بھی قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔'' نعوذ باللہ (''اسلامی نظام'' ص ۹۴۔ از پرویز)

(۳) ''قرآن کریم میں مرکز ملت کو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے تعبیر کیا گیا۔''

(''معارف القرآن'' جلد ۴ ص ۶۳۲۔ از پرویز)